بس ڈرائیور جو خدا بننا چاہتا تھا

ایٹگر کیرٹ کی کہانیاں

PDF BY

Anees ul Hassan Shah

عالمی کتابوں کے اردو تراجم فیس بک گروپ

Whatsapp: +923142893816

بس ڈرائیور، جو خدا بننا چاہتا تھا

(مترجم مبشر علی زیدی)

یہ کہانی ایک ایسے بس ڈرائیور کی ہے جو دیر سے آنے والوں کے لیے بس کا دروازہ نہیں کھولتا تھا۔ کسی کے لیے بھی نہیں۔ نہ ہائی اسکول کے ان مجبور طلبہ کے لیے جو بس کے ساتھ ساتھ بھاگتے اور اسے بے بسی سے دیکھتے، اور نہ بند گلے کی جیکٹوں والے ان مشتعل لوگوں کے لیے جو بس کے دروازے پر ایسے ہاتھ مارتے تھے جیسے وہ وقت پر آئے ہوں اور ڈرائیور نے کوئی غلطی کردی ہو، اور حتی کہ ان مختصر الوجود بوڑھی عورتوں کے لیے بھی نہیں جو خاکی تھیلوں میں گروسری تھامے اپنے لرزتے ہاتھ ہلا ہلا کر اسے روکنے کی کوشش کرتی تھیں۔ اور ایسا نہیں تھا کہ وہ برا آدمی تھا اس لیے دروازہ نہیں کھولتا تھا، بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ کسی کا برا نہیں چاہتا تھا، یہ اس کے لیے نظریاتی معاملہ تھا۔ ڈرائیور کا نظریہ یہ تھا کہ فرض کریں وہ ایک

ایسے شخص کے لیے دروازہ کھولتا ہے جسے صرف تیس سیکنڈ تاخیر ہوئی ہو، تو اگر وہ دروازہ نہیں کھولے گا تو اس شخص کی زندگی کے پندرہ منٹ ضائع ہو جائیں گے، لیکن سماج کے لیے یہ پھر بھی منصفانہ عمل ہو گا، ورنہ بس میں سوار ہر مسافر کے تیس سیکنڈ ضائع ہو جائیں گے۔ اور فرض کریں بس میں ساٹھ افراد سوار ہوں، جنھوں نے کچھ غلط نہ کیا ہو اور سب وقت پر اسٹاپ پر پہنچے ہوں، تو سب کے مجموعی طور پر تیس منٹ ضائع ہوں گے جو ایک شخص کے پندرہ منٹ سے دوگنا نقصان ہو گا۔ یہ واحد وجہ تھی کہ کیوں اس نے کبھی دروازہ نہیں کھولا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ بس میں سوار مسافروں کو اس وجہ کا ذرا بھی علم نہیں ہو گا اور نہ ان لوگوں کو، جو بس کے ساتھ ساتھ دوڑتے تھے اور اسے رکنے کے اشارے کرتے تھے۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ ان میں سے بیشتر اسے دل ہی دل میں گالیاں دیتے ہیں، اور ذاتی طور پر اس کے لیے یہ بہت آسان تھا کہ وہ انھیں بس میں سوار ہونے دیتا اور ان کی مسکراہٹیں اور شکریہ وصول کرتا۔ لیکن جب مسکراہٹیں اور شکریہ ایک طرف ہوں اور سماج کی بھلائی دوسری جانب، تو ڈرائیور وہی کرتا تھا جسے درست سمجھتا تھا۔

ڈرائیور کی اس سوچ سے سب سے زیادہ نقصان جسے پہنچنا چاہیے تھا، اس شخص کا نام ایڈی تھا، لیکن اس کہانی کے دوسرے لوگوں کے برعکس اس نے کبھی بس کے پیچھے بھاگنے کی کوشش تک نہیں کی، وہ اتنا کاہل اور لاپرواہ تھا۔ اب سنیں کہ ایڈی اس ریستوران میں نائب باورچی کے عہدے پر فائز تھا جس کا نام اسٹیک اوے تھا۔ اس کے احمق مالک کے دماغ میں اس سے بہتر ذومعنی نام نہیں آسکا تھا۔ اس ریستوران کا کھانا کوئی خاص نہیں تھا لیکن ایڈی واقعی ایک اچھا انسان تھا۔ اتنا اچھا کہ کبھی کبھی جب اس کا کھانا ٹھیک نہیں بنتا تھا تو وہ خود اسے لے کر ٹیبل پر جاتا اور معذرت کرتا۔ ایک ایسی ہی معذرت کے موقع پر اس کی ملاقات خوشی سے ہوئی، یا یوں کہہ لیں کہ خوشی کی ایک جھلک سے، ایک ایسی لڑکی کی صورت میں جو اتنی پیاری تھی کہ اس نے بھنے ہوئے گوشت کا پورا ٹکڑا صرف اس لیے ختم کرنے کی کوشش کی کہ ایڈی کو برا محسوس نہ ہو۔ اور وہ لڑکی اسے اپنا نام یا فون نمبر نہیں بتانا چاہتی تھی، لیکن اتنی پیاری تھی کہ ایڈی نے اگلی شام پانچ بجے ملنے کی خواہش کی تو اس نے رضامندی ظاہر

کر دی، اس مقام پر جو انھوں نے اتفاق رائے سے طے کی، یعنی کہ ڈولفنیریم میں۔

اب ایڈی کے ساتھ ایک مسئلہ تھا، جس کی وجہ سے وہ زندگی میں ہر چیز کھو بیٹھتا تھا۔ یہ گلے کے غدود کی سوجن یا اس جیسا کوئی مسئلہ نہیں تھا لیکن اس کے باوجود اس نے ایڈی کو بہت نقصان پہنچایا تھا۔ اس بیماری کی وجہ سے وہ ہمیشہ دس منٹ زیادہ دیر تک سوتا رہ جاتا تھا اور کوئی الارم کلاک اس کا کچھ نہیں بگاڑ پاتا تھا۔ اسی لیے ریستوران جاتے ہوئے اسے ہمیشہ دیر ہو جاتی تھی، اور اسے راستے میں ملتا تھا ہمارا بس ڈرائیور، جو ہمیشہ انفرادی سطح کے مثبت جذبات کے بجائے سماج کی بھلائی کو پیش نظر رکھتا تھا۔ سوائے اس ایک موقع کے، جب ایڈی کی خوشی داو پر لگی ہوئی تھی، اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنی اس کیفیت کو شکست دے گا۔ اور سہہ پہر کے قیلولے کے بجائے جاگے گا اور ٹی وی دیکھے گا۔ بطور احتیاط اس نے ایک نہیں بلکہ تین الارم لگا لیے اور ویک اپ کال کی بھی درخواست کر دی۔ لیکن وہ بیماری لاعلاج تھی، اس لیے ایڈی بچوں کا چینل دیکھتے دیکھتے بچوں کی طرح سو گیا۔ جب اربوں کھربوں مرتبہ

الارم بجنے کے بعد اس کی آنکھ کھلی تو وہ پسینے میں شرابور تھا اور دس منٹ تاخیر ہو چکی تھی، اس نے لباس بھی نہ بدلا اور گھر سے نکل کر سیدھا بس اسٹاپ کی طرف بھاگا۔ اسے یہ تک یاد نہیں تھا کہ بھاگتے کیسے ہیں اور اس کوشش میں اس کے قدم بار بار لڑکھڑا رہے تھے۔ اس سے پہلے آخری بار وہ اس وقت دوڑا تھا جب اسے معلوم ہوا تھا کہ اس طرح وہ جم کلاس کا دورانیہ کم کر سکتا ہے، اور یہ چھٹی جماعت کی بات ہے، بس فرق یہ تھا کہ ان جم کلاسز کے مقابلے میں اس بار وہ دیوانوں کی طرح دوڑا تھا کیونکہ اسے کچھ کھونے کا خطرہ تھا، اور سینے میں درد اور پھولا ہوا سانس اس کی خوشی میں حائل نہیں ہو سکتا تھا۔ راہ میں کچھ حائل نہیں ہو سکتا تھا، سوائے ہمارے بس ڈرائیور کے، جس نے اسی وقت دروازہ بند کیا تھا اور بس کو آگے بڑھا رہا تھا۔ ڈرائیور نے عقبی شیشے میں ایڈی کو دیکھ لیا تھا، لیکن جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، اس کا ایک نظریہ تھا، ایک عمدہ دلیل والا نظریہ، جو کسی بھی بات سے زیادہ انصاف سے محبت اور سادہ سے حساب کتاب پر مبنی تھا۔ البتہ ایڈی کو ڈرائیور کے حساب کتاب کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔ زندگی میں پہلی بار سچ مچ وہ کسی جگہ وقت پر پہنچنا چاہتا تھا۔ اسی لیے

وہ بس کے پیچھے بھاگا، اگرچہ اس کی کامیابی کا کوئی امکان نہیں تھا۔ اچانک ایڈی کی قسمت پلٹی، اگرچہ آدھی راہ پر۔ بس اسٹاپ سے سو گز دور ٹریفک کا اشارہ تھا۔ اور بس کے پہنچنے سے چند لمحے پہلے وہ سرخ ہو گیا۔ ایڈی کسی طرح دوڑتے دوڑتے بس تک پہنچ گیا اور خود کو ڈرائیور کے دروازے کے سامنے تک گھسیٹ لیا۔ اس نے دروازہ پر ہاتھ نہیں مارا کیونکہ اس میں اتنی قوت نہیں بچی تھی۔ اس نے بس ڈرائیور کو اپنی نم آنکھوں سے دیکھا اور گھٹنوں کے بل گر کے گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ اسی وقت ڈرائیور کو کچھ یاد آیا، ماضی کا وہ وقت کہ جب بس ڈرائیور بننے کی خواہش سے پہلے اسے خدا بننے کی خواہش تھی۔ یہ ایک اداس کر دینے والی یاد تھی کیونکہ انجام کار وہ خدا نہیں بن سکا تھا، لیکن اس میں خوش ہونے کا پہلو بھی تھا کیونکہ وہ بس ڈرائیور بننے میں کامیاب ہو گیا تھا، جو اس کی دوسری بڑی خواہش تھی۔ اور اچانک ڈرائیور کو یاد آیا کہ کیسے اس نے خود سے وعدہ کیا تھا کہ اگر وہ خدا بنا تو بہت مہربان اور رحیم ہو گا اور اپنی تمام مخلوقات کی دعائیں سنے گا۔ لہذا جب اس نے اپنی ڈرائیور کی بلند نشست سے ایڈی کو دیکھا، جو زمین پر گھٹنوں کے بل بیٹھا ہوا تھا، تو وہ اسے

نظر انداز نہیں کر سکا اور اپنے نظریات اور حساب کتاب کے باوجود اس نے دروازہ کھول دیا، اور ایڈی بس میں چڑھ گیا اور شکریہ تک نہیں کہہ سکا کیونکہ اس کا سانس پھولا ہوا تھا۔

اچھی بات یہ ہو گی کہ آپ یہاں پڑھنا روک دیں کیونکہ اگرچہ ایڈی وقت پر ڈولفنیریم پہنچ گیا تھا، اس کی خوشی نہیں آسکی، کیونکہ خوشی کا پہلے ہی ایک بوائے فرینڈ تھا۔ بات یہ ہے کہ وہ اتنی پیاری تھی کہ اس دن یہ بات بتا ہی نہیں سکی، چنانچہ اس نے ایڈی کو وہاں کھڑے رہنے دیا۔ ایڈی نے اس بینچ پر بیٹھ کر، جس کا دونوں میں اتفاق ہوا تھا، دو گھنٹے تک انتظار کیا۔ وہاں بیٹھے بیٹھے اس کے ذہن میں زندگی سے متعلق تمام مایوس کن خیالات آئے، اور اسی دوران میں اس نے وہاں سورج کو ڈوبتے دیکھا جو ایک خوبصورت نظارہ تھا، اور پھر اس نے سوچا کہ آج کی بھاگ دوڑ کے بعد اس کے پٹھے کس قدر دکھیں گے۔ واپسی پر وہ گھر جلدی پہنچنے کے لیے بے چین تھا، تو اس نے دور سے بس کو دیکھا، جو اسی وقت اسٹاپ پر پہنچی تھی اور مسافر اتر رہے تھے، اور وہ جانتا تھا کہ اگر اس کے بدن میں دوڑنے کی قوت ہوتی تو بھی کسی صورت وہ اسے نہیں پکڑ

سکتا تھا۔ چنانچہ وہ سست قدموں سے چلتا رہا اور ہر قدم پر دس لاکھ تھکے ہوئے پٹھوں کے بارے میں سوچتا رہا، اور جب وہ اسٹاپ پر پہنچا تو اس نے دیکھا کہ بس ابھی تک وہیں کھڑی، اس کی منتظر تھی۔ اور اگرچہ مسافر شور مچارہے تھے اور چلنے کو کہہ رہے تھے، لیکن بس ڈرائیور ایڈی کا انتظار کرتا رہا، اور اس نے ایکسلیریٹر پر اس وقت تک پیر نہیں رکھا جب تک ایڈی بس میں بیٹھ نہیں گیا۔ اور جب بس نے چلنا شروع کیا تو ڈرائیور نے عقبی شیشے میں دیکھا اور ایڈی کو آنکھ ماری جس سے یہ سارا قصہ کچھ برداشت کے قابل ہو گیا۔

بس ڈرائیور جو خدا بننا چاہتا تھا

اٹگر کیرٹ

یہ کہانی ایک بس ڈرائیور کے متعلق ہے جو بس کا دروازہ ان لوگوں کے لئے بھی نہیں کھولتا تھا جو تاخیر کا شکار ہوتے۔ کسی کے لئے بھی نہیں۔ نہ ہی پسے ہوئے طبقے کے سکول کے ان بچوں کے لئے جو بس کے ساتھ ساتھ بھاگتے اور اسے دور تک گھورتے رہتے اور نہ ہی بس کے اسٹیشنوں میں لٹکنے کی کوشش کرنے والے ان لوگوں کے لئے جو دروازے کو پیٹنا شروع کر دیتے جیسے وہ کہہ رہے ہوں کہ درحقیقت وہ وقت پر آئے ہیں، یہ ڈرائیور ہی ہے جو سست ہے سے ہٹا ہوا ہے۔ نہ ہی ان بوڑھی خواتین کے لئے جنہوں نے بھورے رنگ کے سودا سلف سے بھرے ہوئے تھیلے اٹھائے ہوئے ہوتے اور کپکپاتے ہوئے ہاتھوں سے اسے رکنے کا اشارہ کرتیں۔ ایسا نہیں تھا کہ یہ ڈرائیور تمیز دار نہیں تھا، یا اس ڈرائیور کے جسم میں ریڑھ کی ہڈی نہیں تھی۔ یہ ایک نظریاتی مسئلہ تھا۔ ڈرائیور کا ایک نظریہ تھا جو یہ کہتا تھا کہ وہ تاخیر جو کسی ایسے کے لئے دروازہ کھولنے سے ہوتی ہے وہ 30 سیکنڈ سے بھی کم ہے اور دروازہ نہ کھولنے کا مطلب ہے وہ شخص اپنی زندگی کے 15 منٹ کھودے گا مگر یہ پھر بھی معاشرے کے ساتھ انصاف ہوگا کہ دروازہ نہ کھولا جائے کیونکہ دروازے کھولنے میں صرف ہونے والے 30 سیکنڈ بس میں موجود ہر شخص کے ضائع ہوں گے اور اگر بس میں 60 لوگ بیٹھے ہیں جنہوں نے کچھ بھی غلط نہیں کیا اور وہ بس سٹاپ پر

مچھلیوں کے عجائب گھر کے سامنے طے پا گئی۔

اب ایڈی اس حالت میں تھا اور اس سب کو حاصل کرنے کے لئے تیار تھا جو زندگی میں اس سے چھوٹ جاتی رہی ہیں۔ یہ حالت ان حالتوں میں سے ایک حالت ہے کہ جب اپنے آپ ایڈی کے حلق کے تالو کا وہ بڑھا ہوا حصہ جو سونے میں اس کے حلق پر آ جاتا ہے اور جسے وہ اکثر نگل جاتا۔ اس بیماری کی وجہ سے اسے معمول سے دس منٹ زیادہ نیند آتی اور کوئی الارم بھی اثر انداز نہ ہوتا۔ ایسی صورت حال کی وجہ سے پہلے بھی اسے مسائل کا سامنا رہا اور اکثر وہ ''سٹیک وے'' ریستوران تاخیر سے پہنچتا۔ اور وہ بس ڈرائیور جو انفرادی سطح پر مثبت طاقت کی وجہ سے معاشرے کی اچھائی کا انتخاب کرتا ہے، مگر اس بار کے علاوہ جب خوشیاں داؤ پر لگی تھیں ایڈی نے اس حالت کو بدلنے کا ارادہ کیا۔ دوپہر کے قیلولے کے بعد وہ جاگتا رہا اور ٹیلی ویژن دیکھتا رہا۔ احتیاطاً اس نے بیک وقت تین گھڑیوں میں ایک ہی وقت کا الارم لگایا مگر اس کی یہ بیماری عجیب تھی اور بچوں کا ٹی وی چینل دیکھتے ہوئے ایڈی کسی بچے کی طرح سو گیا۔ وہ پسینے کی حالت میں الارم گھڑیوں کی لاکھوں کروڑوں بگڑتی ہوئی آوازوں سے جاگا۔ وہ دس منٹ تاخیر کا شکار تھا وہ لباس تبدیل کئے بغیر گھر سے باہر بس سٹاپ کی طرف بھاگا۔ وہ بھول گیا کہ کیسے دوڑا جاتا ہے۔ اس کے پاؤں جیسے ہی سڑک پر پڑتے وہ لڑکھڑا جاتے۔

آخری بار وہ اس وقت بھاگا تھا جب اسے پتہ چلا تھا کہ اس کی ورزش کی کلاس ختم ہو گئی ہیں۔ اس وقت وہ چھٹی کلاس میں تھا۔ ورزش کی کلاسوں کے بعد وہ آج اتنے پرجوش انداز میں بھاگ رہا تھا کیونکہ اسے کچھ کھونے کا ڈر تھا، اس کے سینے میں اٹھنے والا تمام درد اس کی خوشیوں کے حصول میں حائل نہیں ہو سکتا۔ اس کے راستے میں کوئی بھی چیز حائل نہیں ہو سکتی تھی۔ سوائے اس بس ڈرائیور کے جس نے ابھی ابھی دروازہ بند کیا تھا اور

بس کو آگے بڑھا دیا تھا۔

ڈرائیور نے ایڈی کو پیچھے دیکھنے والے شیشے میں سے دیکھا لیکن جیسے ہم نے پہلے بتایا کہ اس کا اپنا نظریہ تھا، ایک نظریہ جس کی مدلل وجوہات بھی تھیں، کسی بھی چیز سے زیادہ جو انصاف سے محبت اور سادہ ریاضیاتی عمل پر منحصر تھیں۔

یہ الگ بات ہے کہ ایڈی کو ڈرائیور کی حسابیات کی پرواہ نہیں تھی۔

زندگی میں پہلی بار وہ کہیں وقت پر پہنچنا چاہتا تھا اور اسی لئے وہ بس کا تعاقب کر رہا تھا۔ اگرچہ بس رکنے کی توقع کم ہی تھی۔ اچانک ایڈی کی قسمت جاگی مگر آدھی، بس سٹاپ سے کوئی سو قدم آگے ٹریفک سگنل تھا اور ایک سیکنڈ پہلے بس یہاں پہنچی اور بتی سرخ ہو گئی۔ ایڈی بمشکل بس کے قریب پہنچا اور خود کو دھکیلتا ہوا ڈرائیور کے دروازے کی طرف بڑھا۔ وہ اتنا کمزور ہو رہا تھا کہ شیشے کو تھپتھپا بھی نہیں سکتا تھا۔ اس نے نیم وا آنکھوں سے ڈرائیور کو دیکھا۔ اور گھبراہٹ کے ساتھ اپنے گھٹنوں پر ڈھیہ گیا۔ اس عمل نے ڈرائیور کو کچھ یاد دلا دیا۔ ایسا کچھ جس کا تعلق ماضی سے تھا اس وقت سے جب وہ بس ڈرائیور بننا نہیں چاہتا تھا بلکہ جب وہ خدا بننا چاہتا تھا۔

یہ ایک اداس یاد تھی کیونکہ اس کے اختتام پر ڈرائیور خدا نہیں بن سکا مگر یہ خوشی کی بات تھی کہ وہ بس ڈرائیور بن گیا۔ جو اس کی دوسری ترجیح تھی۔ بس ڈرائیور نے یاد کیا کہ کیسے اس نے خود سے وعدہ کیا تھا کہ جب وہ بالآخر خدا بن جائے گا وہ مہربان اور رحمدل ہو گا اور تمام مخلوق کی بات سنے گا۔ پس جب اس نے نشست پر بیٹھے ہوئے ایڈی کو اسی حالت میں دیکھا گھٹنوں پر بیٹھے رال ٹپکاتے، وہ اسے برداشت نہ کر سکا۔ اپنے تمام نظریات کے باوجود اس نے دروازہ کھول دیا اور ایڈی اوپر آ گیا۔ اس کی سانس اتنی پھولی ہوئی تھی کہ اس نے ڈرائیور کو شکریہ بھی نہیں کہا۔

وقت سے پہلے پہنچے ان سب کا مجموعی طور پر آدھ گھنٹہ ضائع ہو جائے گا جو کہ 15 منٹ سے دگنا ہے۔ یہ واحد وجہ تھی جس کی وجہ سے وہ دروازہ نہیں کھولتا تھا۔

وہ جانتا تھا کہ مسافروں کو درست اندازہ نہیں ہے کہ اس کی کیا وجہ ہے اور وہ لوگ جو بس کے پیچھے بھاگتے ہیں اور ہاتھ سے اسے رکنے کا اشارہ کرتے ہیں انہیں تو بالکل بھی اندازہ نہیں ہے۔ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ ان میں سے بہت سے لوگ اسے کمینہ سمجھتے ہیں اور ذاتی طور پر اس کے لئے یہ بہت آسان تھا کہ ان کو سوار ہونے دیتا اور بدلے میں مسکراہٹیں اور شکریئے وصول کرتا۔ ایک طرف شکریئے اور مسکراہٹیں ہیں اور دوسری طرف وہ جو معاشرے کی اچھائی میں ہے، یہ ڈرائیور جانتا تھا کہ اسے کس چیز کا انتخاب کرنا ہے۔

وہ آدمی جو ڈرائیور کے اس نظریے کے عتاب کا سب سے زیادہ شکار ہوا اس کا نام ایڈی تھا۔ مگر اس کہانی میں موجود دوسرے لوگوں کے برعکس اس نے بس کے پیچھے بھاگنے کی کوشش نہیں کی۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ کتنا سست اور ناکارہ تھا۔

تب ایڈی ''سٹیک وے'' نامی ریستوران میں معاون باورچی تھا۔ وہ جب سے یہاں آیا تھا اس کے مالک کا یہ وہم تھا کہ یہ ریستوران جو گھر جیسے کھانوں کے لئے مشہور ہے ایڈی کچھ بھی اچھا نہیں بناتا مگر ایڈی بذات خود ایک اچھا آدمی تھا۔ اتنا اچھا کہ جب کبھی بھی وہ کوئی چیز بناتا وہ اچھی نہ بنتی اور ایڈی کو وہ چیز خود میز پر پیش کرنا پڑتی اور معذرت بھی۔ انہی ملازمتوں کے درمیان اس کی ملاقات ''خوشی'' سے ہوئی۔ آخری اور مختصر خوشی سے۔ یہ خوشی ایک لڑکی کی شکل میں تھی جو اتنی پیاری تھی کہ اس نے بھنے ہوئے گوشت کا سارا ٹکڑا کھا لیا جو ایڈی اس کے لئے لایا تھا۔ اس نے ذرا سا بھی برا نہیں منایا۔ یہ لڑکی اپنا نام اور فون نمبر نہیں بتانا چاہتی تھی مگر وہ اتنی اچھی تھی کہ وہ ایڈی سے ایک ملاقات کے لئے راضی ہو گئی۔ یہ ملاقات اگلے دن پانچ بجے دونوں کی رضامندی سے ٹھیک

اس کہانی کا اہم موڑ یہ ہے کہ ایڈی مقررہ وقت پر ڈالفن مچھلیوں کے عجائب گھر کے سامنے پہنچ گیا مگر "خوشی" وہاں نہیں آئی کیونکہ خوشی کا پہلے ہی ایک محبوب تھا وہ اتنی اچھی تھی کہ وہ ایڈی کو یہ بتانے کی ہمت نہیں کر سکی۔ بس اس نے وہاں نہ آنے میں عافیت سمجھی۔ ایڈی اس بنچ پر تقریباً دو گھنٹے بیٹھا رہا جس پر انہوں نے ملاقات کا وقت طے کیا تھا۔ جب وہ وہاں بیٹھا تھا اسے زندگی کے بارے میں ہر طرح کے مایوس خیالات آتے رہے۔ وہاں بیٹھے ہوئے اس نے سورج کو غروب ہوتے ہوئے دیکھا۔ جو خاصہ خوبصورت لگ رہا تھا۔ اس نے سوچا کہ وہ آنے والا وقت کیسے گزارے گا۔ گھر واپس جاتے ہوئے جب وہ خاصا مایوس تھا اس نے بس کو فاصلے سے دیکھا۔ اپنے آپ کو دھکیلتے ہوئے مسافروں کے درمیان گھسٹتے ہوئے اس نے سوچا۔ وہ اب بھاگ نہیں سکتا اور بس بھی نہیں پکڑ پائے گا۔ پس وہ آہستہ آہستہ چلتا رہا اور ہر قدم پر اپنے اعصاب کو لاکھوں درجے بھاری ہوتے ہوئے محسوس کرتا رہا اور بالآخر جب وہ بس سٹاپ پر پہنچ گیا۔ اس نے دیکھا کہ بس اس کے انتظار میں ابھی تک وہیں تھی جبکہ مسافر چلا رہے تھے اور چہ میگوئیاں کر رہے تھے کہ بس کو چلایا جائے۔ مگر ڈرائیور ایڈی کے انتظار میں تھا اور اس نے اس وقت تک بس کو نہیں چلایا جب تک ایڈی اپنی سیٹ پر نہیں بیٹھ گیا اور جب وہ روانہ ہو گئے اس نے سامنے لگے ہوئے شیشے سے ایڈی کی طرف دیکھتے ہوئے اداسی کے ساتھ پلکوں کو جھکایا جس نے کسی حد تک تمام صورت حال کو قابل برداشت بنا دیا تھا۔

☆..........☆

رحم مادر

(مترجم اسماء حسین، نیویارک، امریکہ)

میری پانچویں سالگرہ پر انکشاف ہوا کہ میری ماں کو کینسر ہے ۔ ڈاکٹروں نے کہا ہے کہ بچہ دانی نکالنی ہو گی ۔ وہ بہت اُداس دن تھا۔ ہم سب والد صاحب کی سبارو میں سوار ہو کر اسپتال پہنچ گئے اور آپریشن ختم ہونے کا انتظار کرنے لگے ۔ڈاکٹر آپریٹنگ روم سے باہر آیاتواُس کی آنکھوں میں آنسو تھے ۔"میں نے کبھی اتنی خوبصورت بچہ دانی نہیں دیکھی۔"اُس نے سرجیکل ماسک اُتارتے ہوئے کہا۔"میں خود کو قاتل محسوس کر رہاہوں۔"میری ماں کی بچہ دانی واقعی بہت خوبصورت تھی اتنی خوبصورت کہ اسپتال نے وہ ایک میوزیم کو عطیہ کر دی۔ ہفتے والے دن ہم خاص طور پر وہاں گئے اور میرے انکل نے اُس کے ساتھ ہماری ایک تصویر لی۔ اُس وقت میرے والد ملک میں موجود نہیں تھے ۔اُنہوں نے آپریشن کے اگلے دن ہی میری ماں کو طلاق

دے دی تھی۔ "بغیر بچہ دانی کے عورت، عورت نہیں رہتی اور جو مرد ایسی عورت کے ساتھ رہتا ہے وہ خود بھی مرد نہیں رہتا۔" اُنھوں نے میرے بڑے بھائی اور مجھے الاسکا جانے والے جہاز میں سوار ہونے سے ایک سیکنڈ پہلے کہا۔ "جب تم بڑے ہوگے تو سمجھ جاؤ گے۔"

جس کمرے میں انتظامیہ نے میری ماں کی بچہ دانی کو رکھا ہوا تھا وہاں مکمل اندھیرا تھا۔ ہلکی ہلکی روشنی صرف بچہ دانی میں سے پھوٹ رہی تھی جیسے رات کی فلائٹ کے دوران جہاز کے اندر دھیمی سی روشنی ہوتی ہے۔ کیمرے کے فلش کی وجہ سے تصویر میں یہ روشنی نظر نہیں آتی تھی لیکن جب میں نے اُسے قریب سے دیکھا تب میں سمجھ سکا کہ کیوں اسے دیکھ کر ڈاکٹر کی آنکھ میں آنسو آئے تھے۔ "تم یہاں سے دنیا میں آئے تھے." میرے انکل نے بچہ دانی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "یقین کرو، تم لوگ وہاں شہزادوں کی طرح رہتے تھے۔ تمھاری ماں بھی کیا خوب عورت تھی، کیا اچھی ماں تھی۔"

آخر کار میری ماں مر گئی۔ آخر سب کی مائیں مر جاتی ہیں۔ میرے والد قطب شمالی کے ایک مشہور سیاح اور وہیل مچھلی کے شکاری بن گئے۔ جن

لڑکیوں کے ساتھ میرے رومانوی تعلقات تھے جب میں ان کی بچہ دانیوں کے اندر جھانکتا تو وہ مجھے غلط سمجھتی تھیں ۔ وہ سوچتیں کہ نسوانی تولیدی اعضاء میرے دماغ پر سوار ہیں اور یوں میرا موڈ خراب ہو جاتا تھا۔ آخر ان میں سے ایک اچھی لڑکی مجھ سے شادی کرنے پر رضامند ہو گئی۔ میں شیر خوارگی سے ہی اپنے بچوں کے چوتڑوں پر تھپڑ لگاتا تھا کیونکہ ان کا رونا میرے اعصاب مختل کر دیتا تھا۔ بچے جلد ہی سمجھ گئے اور تقریباً نو ماہ کی عمر تک پہنچ کر رونا ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا۔ پہلے میں بچوں کو ان کی سالگرہ کے دن دادی کی بچہ دانی دیکھانے میوزیم لے جاتا تھا لیکن انہیں اس میں کوئی دلچسپی نہیں تھی اور میری بیوی بھی غصّہ ہوتی تھی اس لیے میں انہیں میوزیم کی بجائے والٹ ڈزنی فلمیں دکھانے لے جانے لگا۔

ایک دن میری کار پولیس اٹھا لے گئی ۔ پولیس لاٹ میوزیم کے قریب تھی ۔ کار وصول کرنے کے بعد میں میوزیم چلا گیا۔ بچہ دانی اپنی جگہ موجود نہیں تھی۔ انتظامیہ نے اسے ایک کونے کے کمرے میں رکھ دیا تھا، جو پرانی تصاویر سے بھرا ہوا تھا۔ میں نے نزدیک جا کر اسے دیکھا تو وہ سبز

پھپھوندی سے ڈھکی ہوئی تھی۔ میں نے محافظ سے پوچھا کوئی اس کی صفائی کیوں نہیں کرتا، لیکن اس نے لاعلمی سے کندھے اُچکا دیئے۔ میں نے نمائش کے انچارج سے التجا کی کہ اگر میوزیم میں اہلکاروں کی کمی ہے تو مجھے صفائی کی اجازت دے دے مگر وہ بہت ہی گھٹیا آدمی تھا اس نے کہا کیوں کہ میں میوزیم کا ملازم نہیں ہوں اس لیے میں کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگا سکتا۔ میری بیوی نے بھی کہا کہ میوزیم انتظامیہ سو فیصد درست ہے ۔ اس کا خیال تھا کہ پبلک اداروں کے اندر ایک بچہ دانی کی نمائش پاگل پن ہے، خاص کر ایسی جگہ جہاں بچوں کی آمدورفت بھی زیادہ ہوتی ہو۔ لیکن میں ایسا نہیں سوچتا تھا۔ میں سوائے اس کے اور کچھ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ میں دل کی گہرائیوں سے جانتا تھا کہ اگر میں نے میوزیم کے اندر گھس کر اسے نہ چرایا اور اس کی دیکھ بھال نہیں کی تو میں وہ نہیں رہوں گا جو میں ہوں۔ بالکل اپنے والد کی طرح جیسے انہیں جہاز پر سوار ہونے سے پہلے پتا تھا، مجھے بھی معلوم تھا کہ میں نے کیا کرنا ہے۔ دو دن بعد میں نے اپنے آفس سے وین لی اور میوزیم بند ہونے سے کچھ وقت پہلے وہاں پہنچ گیا۔ کمرے خالی تھے لیکن اگر مجھے کسی کا سامنا کرنا بھی پڑ

جاتا تو مجھے کوئی پروا نہیں تھی ۔میرے پاس ہتھیار کے ساتھ ایک بہترین منصوبہ بھی تھا۔ لیکن اصل مسئلہ یہ تھا کہ بچہ دانی خود غائب تھی ۔ نمائش انچارج مجھے دیکھ کر حیران ہوا لیکن جب میں نے اپنی پستول اس کے حلق میں گھسادی تو اس نے سب کچھ اگل دیا۔ بچہ دانی ایک مخیر یہودی کو بیچ دی گئی تھی اور اس نے وہ الاسکا کے ایک کمیونٹی سینٹر کو عطیہ کر دی ۔ راستے میں ایک ماحولیاتی تحفظ کی ایک تحریک کی مقامی شاخ کے کچھ افراد نے اسے اغواء کر لیا۔ تحریک نے ایک اعلامیہ جاری کیا کہ بچے دانی کا اصل مقام قید نہیں ہے لہذا اسے قدرتی ماحول میں آزاد کر دینے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ خبر رساں ایجنسی کے مطابق یہ ماحولیاتی تحریک انتہا پسند اور خطرناک ہے۔ اس کا پورا نظام ایک قزاق جہاز سے چلایا جاتا ہے، جس کا سربراہ ایک ریٹائرڈ وہیل مچھلی کا شکاری ہے۔ میں نے نمائش انچارج کا شکریہ ادا کیا اور پستول ہٹالی۔ گھر واپس آتے ہوئے مجھے سارے سگنلز سرخ ملے۔ شیشہ دیکھنے کی زحمت کیے بغیر میں مستقل لین پر لین بدلتا رہا اور اپنے حلق میں پھنسے غیر مرئی گولے سے نجات کی کوشش کرتا رہا۔ میں نے اپنی ماں کی بچہ دانی کو تصور کرنے کی کوشش کی، وہ

شبنم کے قطروں سے بھیگے سرسبز میدان کے درمیان ٹونا اور ڈولفن سے بھرے سمندر میں تیر رہی تھی۔

ڈائریکٹر کا کٹ

(مترجم اسماء حسین، نیویارک، امریکہ)

میسک سمولانسکی ایک فلمساز، تاجر اور فلسفی تھا۔ لیکن سب سے بڑھ کر وہ کاملیت پسند تھا۔ یہ ہی وجہ تھی کہ کسی کو حیرت نہیں ہوئی جب اس نے اعلان کیا کہ اس کی نئی فلم "زندگی" میں انسانی زندگی کو لمحہ بہ لمحہ براہ راست تین کیمروں سے فلم بند کیا جائے گا۔ عکس بندی فلم کے کم گو ہیرو میتیعُش کروٹوچاوسکی کی پیدائش سے شروع ہوئی اور تہتر سال بعد اختتام پذیر ہوئی۔ آخری منظر میں میتیعُش آخری درجے کا پراسٹیٹ کینسر کی تشخیص ہونے کے بعد خود کو اپنے گھر کے بیسمنٹ میں پھانسی لگا کر ختم کر لیتا ہے۔ اس منظر کے دوران سیٹ پر موجود ہر شخص کی آنکھ اشکبار تھی یہاں تک کہ ساونڈ ٹیکنیشنز کے مسلسل چپ ہو جانے کے اشارے بھی عملے کے آنسو نہیں روک سکے۔

پوسٹ پراڈکشن میں مزید ایک سو چودہ سال صرف ہوئے اور اس پر کام شروع ہونے کے چند ماہ بعد ہی میسک بڑھاپے کے باعث مر گیا۔ ساونڈ

ایڈیٹنگ مزید چھیانوے سال جاری رہی، اس کے باوجود جب فلم ریلیز ہوئی تو سوشل میڈیا پر کئی شکایات گردش کر رہی تھیں کہ فلم جلدبازی میں اور بے ڈھنگے پن سے بنائی گئی ہے۔

فلم کے پریمئیر پر ممتاز فلم نقادوں کو دعوت دی گئی اور جو چند ٹکٹ عوام کے لیے مختص کیے گئے تھے وہ بھی بے تحاشہ مہنگے داموں بلیک مارکیٹ میں فروخت ہوئے۔ وعدے کے مطابق پریمئیر تہتر سال طویل تھا۔ اختتام پر کریڈٹ کی فہرست چلنے اور روشنیاں کھول دینے کے بعد سینما ہال کے ملازمین کو ایک آدمی کے سوا تمام ناظرین مردہ حالت میں ملے۔ زیادہ تر لاشوں سے سخت تعفن اٹھ رہا تھا۔ واحد زندہ رہ جانے والا گنجا اور ننگا ناظر سڑتی ہوئی لاشوں کے درمیان اکیلا بیٹھا کسی بچے کی طرح سبکیاں بھر رہا تھا۔ جب اس کے آنسو گرنا بند ہوگئے تو وہ آنکھیں پونچھ کر کھڑا ہوا اور نشستوں کے درمیان سے باہر نکل آیا۔

یہ بوڑھا آدمی ایک مشہور فلم نقاد کا بیٹا تھا جو فلم دیکھنے بیٹھی تھی تو یہ تک نہیں جانتی تھی کہ وہ امید سے ہے۔ وہ فلم کی نمائش کے آٹھ ماہ بعد پیدا

ہوا اور تاریک سینما کی اسکرین میں غرق بڑا ہوا۔ جب وہ دروازے کھول کر باہر گلی میں نکلا تو سورج کی روشنی سے اس کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ درجنوں رپوٹرز نے تھیٹر کے باہر اس کے سامنے مائکروفون بڑھا دیئے اور پوچھا کہ فلم کے بارے میں اُس کی کیا رائے ہے۔

"فلم ؟ "

اس نے سورج کی روشنی کے آگے پلکیں جھپکاتے ہکلا کر کہا۔ وہ تو ابتداء سے فلم کو زندگی ہی سمجھ رہا تھا۔

ایک گرام

(مترجم کنیز فاطمہ، ملتان)

میرے گھر کے ساتھ والی کافی شاپ پر ایک بہت پیاری ویٹریس کام کرتی ہے۔ وہاں ایک بیٹی بھی ہے جو باورچی خانے میں کام کرتی ہے، اس نے مجھے بتایا کہ اس ویٹریس کا نام شکما ہے، اور اس کا کوئی بوائے فرینڈ نہیں ہے، اور وہ تفریحی (نشہ آور) ادویات کی شوقین ہے۔ جب تک اس کافی شاپ پر انتظار کرنے والوں کے لئے وہیں بیٹھنے کا انتظام نہیں تھا، میں اس جگہ کبھی بھی نہیں گیا تھا- ایک بار بھی نہیں۔ لیکن اب آپ مجھے ہر صبح وہاں کرسی پر بیٹھا دیکھ سکتے ہیں۔ میں وہاں ایسپریسو (تیز کافی) پیتا ہوں۔ اس سے تھوڑی بات کرتا ہوں، ان چیزوں کے بارے میں جو میں نے اخبار میں پڑھی ہوں، دوسرے گاہکوں کے بارے میں، کوکیز کے بارے میں۔ کبھی کبھی میں اسے ہنسانے کا انتظام بھی کرتا ہوں۔ اور جب وہ ہنستی ہے تو مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔

میں نے کئی بار اس کو فلم دیکھنے کی دعوت دینے کا سوچا۔ دراصل ایک فلم کی دعوت صرف ابتدا ہوتی ہے۔ ساتھ فلم دیکھنے کا پوچھنا اصل میں رات کے کھانے پر باہر لے جانے کیلئے پہلا قدم ہے۔ یا پھر چھٹی والے دن ایلات (اسرائیل کا ایک شہر) کے ساحلِ سمندر پر ساتھ چلنے کی دعوت بھی دی جا سکتی ہے۔ کسی سے فلم پر ساتھ چلنے کو کہنے کی صرف ایک وجہ ہو سکتی ہے۔ بنیادی طور پر اس کا مطلب یہ کہنا ہے کہ، "میں آپ کو چاہتا ہوں۔" لیکن اگر اسے کوئی دلچسپی نہ ہوئی اور اس نے ساتھ جانے سے انکار کر دیا تو یہ سب کچھ ناخوشگوار ہو جائے گا۔ اسی وجہ سے، اس کے ساتھ بیٹھ کر مشترکہ سگریٹ نوشی کی پیشکش کرنا مجھے زیادہ بہتر لگا۔

اس صورتحال میں زیادہ سے زیادہ برا یہی ہو گا کہ وہ کہہ دے گی کہ، "میں تمباکو نوشی نہیں کرتی" اور میں پتھر پھینکنے والوں کے بارے میں کچھ مذاق کروں گا، اور ایسا لگے گا کہ گویا کچھ بڑی بات نہیں ہوئی، ایک اور کافی منگواؤں گا اور آگے چلتا بنوں گا۔ اسی لیے میں نے ایوری کو فون کیا۔ ایوری میرے ہائی اسکول کی کلاس میں واحد شخص تھا جو بہت زیادہ تمباکو نوشی کرتا

تھا۔ ہمیں بات کئے ہوئے دو سال سے زیادہ کا عرصہ ہو چکا تھا۔ میں نمبر ملاتے وقت اپنے دماغ میں فرضی چھوٹی چھوٹی باتیں سوچ رہا تھا۔ جو فون کرنے کا اصل مقصد بیان کرنے سے پہلے مجھے اس سے کرنی تھیں۔ لیکن جب میں نے اپنے دوست ایوری سے پوچھا کہ وہ کیسا ہے، تو اس نے کہا ایک دم بور اور پریشان۔ اس نے بتایا کہ شام میں ہونے والے مصائب کی وجہ سے ہم پر لبنان کی سرحد کو بند کر دیا گیا ہے، اور انہوں نے مصر کو بھی القاعدہ کے گھٹیا پن کی وجہ سے بند کر دیا ہے۔ اور مجھے کہنے لگا کہ سگریٹ نوشی (نشہ) کے لیے میرے پاس کچھ نہیں ہے میرے بھائی۔ میں نے پھر بات بدلتے ہوئے اس سے پوچھا کہ اور کیا ہو رہا ہے آج کل؟ اس نے مجھے ایک دو جواب دیئے، حالانکہ ہم دونوں جانتے تھے کہ مجھے اس کے کسی جواب میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ اس نے مجھے بتایا کہ اس کی گرل فرینڈ حاملہ ہے، اور وہ دونوں یہ بچہ پیدا کرنا چاہتے ہیں اور یہ کہ اس کی گرل فرینڈ کی بیوہ ماں نہ صرف ان پر شادی کے لیے دباؤ ڈال رہی ہے بلکہ وہ شادی کی باقائدہ ایک مذہبی تقریب بھی چاہتی ہے۔ کیونکہ اس کا کہنا ہے کہ اگر اس کی بیٹی کے مرحوم والد زندہ ہوتے تو ان

کی بھی یہی خواہش ہوتی۔ اب اس طرح کی دلیل کو کیسے برداشت کیا جا سکتا ہے! ایسے حالات میں کوئی کیا کر سکتا ہے؟ باپ کی قبر کو کھود کر تو اس سے پوچھنے سے رہے۔

باتوں کے دوران ایوری جب بھی جذباتی ہونے لگتا میں اس کو پر سکون کرنے کی کوشش کرتا، اور اسے سمجھاتا کہ یہ کوئی اتنی بڑی بات نہیں جس پہ جذباتی ہوا جائے۔ کیونکہ میرے لیے یہ سچ میں کوئی بڑی بات نہیں تھی کہ ایوری کی شادی کسی مذہبی تقریب کے طور پر سب کے سامنے ہو یا نا ہو۔ یہاں تک کہ اگر وہ ہمیشہ کے لیے ملک چھوڑنے یا اپنی جنس تبدیل کرنے کا بھی سوچ رہا ہے تو میرے لئے یہ سب غیر اہم باتیں تھیں۔ میرے لئے صرف اہم تھا شکما کے لیے نشہ (چرس) کا انتظام کرنا۔ تو میں نے اس کے سارے مسئلے کو مزید سننے کا ارادہ ترک کرتے ہوئے پوچھا: "یار، کسی نہ کسی کے پاس سے تو اچھی چرس مل ہی سکتی ہو گی، مل سکتی ہے ناں؟ مجھے بہت زیادہ نہیں چاہئے۔ مجھے بس تھوڑی سی چاہئے اور یہ میں ایک ایسی لڑکی کے لئیے کر رہا ہوں جو میرے لئے بہت خاص ہے اور میں اس کو متاثر کرنا چاہتا ہوں۔ ایوری

بولا کہ "میں تمھاری قسم کھا کر بتا رہا ہوں، میں نے خود بھی ایک اور نشہ پینا شروع کر دیا ہے، اس میں بھی کافی حد تک سرور ملتا ہے "۔ لیکن میں نے صاف انکار کر دیا اور اس کو بتایا کہ میں شکما کو کوئی مصنوعی گندگی نہیں دینا چاہتا ۔ "یہ اس کو اچھا نہیں لگے گا۔" "میں جانتا ہوں،" وہ پھر سے بڑبڑایا۔ "میں جانتا ہوں، لیکن، ابھی اور کوئی راستہ بھی نہیں ہے۔

دو دن بعد، ایوری نے مجھے صبح کے وقت فون کیا اور مجھے بتایا کہ اس کے پاس میرے کام کی کچھ چیز ہے تو سہی، لیکن کچھ پیچیدہ ہے۔ میں نے اسے یقین دلایا کہ اگر اس کے پاس کچھ مہنگی چیز بھی ہے تو بھی میں قیمت ادا کرنے کے لیے تیار ہوں۔ مجھے صرف ایک ہی بار چاہئے اور صرف ایک گرام چاہیے۔ وہ ناراض ہو کر بولا "میں نے مہنگی نہیں کہا"۔ "میں نے کہا 'پیچیدہ' تم مجھے چالیس منٹ بعد کارلیباچ اسٹریٹ (گلی) پر ملو، وہاں مل کر میں تفصیل بتاؤں گا۔" لیکن مجھے اس وقت کسی قسم کی "پیچیدہ" چیز کی ہرگز ضرورت نہیں تھی۔ اور مجھے ہائی اسکول کے زمانے سے یاد ہے۔ ایوری کی "پیچیدہ" چیزیں سچ میں بہت پیچیدہ ہوتی تھیں۔

لیکن سچ کہوں تو مجھے چرس بہت کم مقدار میں چاہئے تھی۔ مجھے تو صرف ایک خوبصورت لڑکی کے ساتھ تمباکو نوشی کرنا تھی جو میرے ساتھ بیٹھ کر میری باتوں پر ہنسے۔ میں ابھی کسی بھی سخت قسم کے مجرموں کے ساتھ ملاقات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ نہ کسی سے کہیں پر بھی ملنے جانا چاہتا تھا۔ ایک تو ٹیلی فون پر ایوری کا لہجہ مجھے پریشان کر رہا تھا اور دوسرا اس نے دو بار "پیچیدہ" لفظ کا استعمال کیا تھا یہ بات بھی مجھے پریشان کر رہی تھی۔ جب میں اس کے بتائے ہوئے پتے پر پہنچا، تو ایوری اپنے سکوٹر پر ہیلمٹ کے ساتھ میرا انتظار کر رہا تھا۔ سیڑھیاں چڑھتے وقت اس نے بتایا کہ یہ آدمی جس سے ہم ملنے جا رہے ہیں، ایک وکیل ہے۔ میری ایک دوست ہر ہفتے اس کے گھر کی صفائی کرتی ہے ،لیکن وہ یہ کام پیسوں کے لئے نہیں کرتی۔ بلکہ وہ یہ کام صرف ایک خاص قسم کی (طبی) نشہ کے لیے کرتی ہے۔ اس وکیل کو کسی قسم کا کینسر ہے۔ مجھے یہ تو نہیں معلوم کہ جسم کے کسی حصے میں ہے لیکن ڈاکٹر نے اس کو ماہانہ چالیس گرام چرس پینے کا نسخہ لکھ کر دیا ہوا ہے، لیکن وہ بمشکل تھوڑی سی ہی پی سکتا ہے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ کیا وہ اپنا یہ بوجھ مزید کم کرنا چاہتا ہے؟ تو اس

نے کہا کہ وہ اس پر بعد میں بات کرے گا، لیکن مجھے یہ بات سمجھ نہیں آئی کہ اس نے یہ اصرار کیوں کیا کہ میرے پاس دو لوگ آئیں۔ اسی لئے میں نے فون اٹھایا اور تمہیں کال کر دی یہاں آنے کے لیے۔

"ایوری،" میں نے اسے مخاطب کرتے ہو کہا، "میں نے تمھیں صرف تھوڑی سی مقدار میں اچھی چرس کا کہا تھا۔ میں کسی ایسے وکیل کے ساتھ منشیات کے چکر میں نہیں پھسنا چاہتا جس سے میں پہلے کبھی ملا بھی نہیں۔ ایوری بولا کہ "یہ کوئی سودا نہیں ہے۔" "وہ صرف ایک آدمی ہے جس نے اصرار کیا ہے کہ دو آدمی ملنے آئیں۔ اس نے التجا کی کہ ہم دونوں بات کرنے کے لئے اس کے اپارٹمنٹ کے پاس رک جائیں گے۔ اگر وہ کچھ ایسا کہتا بھی جو ہمیں مناسب نہیں لگتا تو ہم الوداع کہہ کر چل پڑیں گے۔ ویسے بھی، آج کوئی معاہدہ نہیں ہو گا۔ میرے پاس اس وقت کوئی پیسے بھی نہیں ہیں۔ آج کے دن بس زیادہ سے زیادہ یہ ہو گا کہ ہمیں پتہ چل جائے گا کہ یہاں ہو کیا رہا ہے۔ مجھے ابھی تک یہ سب بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ میں کوئی خطرہ محسوس کر رہا تھا، ہاں لیکن مجھے یہ ضرور لگ رہا تھا کہ کوئی بدمزگی

ضرور ہونے والی ہے۔ اور میں فی الحال کوئی بدمزگی نہیں چاہتا تھا۔ انجان لوگوں کے ساتھ انجان گھروں میں بیٹھنا، اس قسم کے عجیب ماحول میں — یہ سب مجھے برا لگتا ہے۔ ایوری نے مجھے کہا کہ، تم بس اوپر جاؤ اور دو منٹ کے بعد ایسے ظاہر کرنا کی تمھیں کوئی میسج آیا ہے جس کی وجہ سے تمھیں کچھ جلدی ہے اور وہاں سے نکلنا پڑ رہا ہے۔ لیکن مجھے پیچھے چھوڑ کر مت بھاگ جانا۔ اس نے کہا ہے کہ دو لوگ ملنے آئیں۔ بس اب میرے ساتھ گھر کے اندر چلو تا کہ میں بیوقوف نہ لگوں، اس کے ایک منٹ بعد بیشک تم الگ ہو جانا۔ مجھے ابھی بھی کچھ ٹھیک نہیں لگ رہا تھا لیکن ایوری جب اس طرح پیچھے پڑتا ہے تو انکار مشکل ہو جاتا ہے۔

وکیل کا آخری نام شاید کورمین تھا، یا کم از کم دروازے پر یہی لکھا ہوا تھا۔ اور دیکھنے میں یہ آدمی بالکل ٹھیک ٹھاک لگ رہا تھا۔ اس نے ہمیں کوکس (مشروب) پیش کیں اور گلاسوں میں لیموں کے ٹکڑے اور برف بھی ڈال دی۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے ہم ہوٹل کے کسی بار میں آئے بیٹھے ہیں۔ اس کا اپارٹمنٹ بھی کافی بہتر تھا، کافی روشن اور خوشبودار۔ "دیکھو" اس نے کہا،

"مجھے ایک گھنٹے میں عدالت میں حاضر ہونا ہے۔ ایک دس سالہ بچی کا کیس ہے جسے کوئی کار سے ٹکر مار کر بھاگ گیا تھا۔ ڈرائیور کو بمشکل ایک سال کی قید ہوئی اور وہ آزاد ہو گیا۔ لیکن اب میں اس بچی کے والدین کی نمائندگی کر رہا ہوں، والدین نے اس ڈرائیور کے خلاف 20 لاکھ ہرجانہ کا مقدمہ کیا ہے۔۔ جس لڑکے نے اسے مارا وہ ایک عرب لڑکا ہے اور ایک امیر گھرانے سے تعلق رکھتا ہے۔ "واہ زبردست، " ایوری نے کہا، جیسے اس کو سب پتہ ہو کہ کورمین اصل میں کس کے بارے میں بات کر رہا ہے۔ "لیکن ہم یہاں کسی اور موضوع پر بات کرنے آئے ہیں، ہم ٹینا کے دوست ہیں۔ ہم دراصل چرس کے بارے میں بات کرنے آئے ہیں۔

"اگر آپ مجھے اپنی بات کو ختم کرنے کا موقع دیں گے تو ہی میں آپ کو اپنی ساری بات سمجھا پاؤں گا۔ ڈرائیور کا پورا خاندان اس کی مدد کرنے کے لیے تیار ہے۔ دوسری طرف وہ جو لڑکی مر گئی ہے اس کے والدین کے علاوہ کوئی بھی ان کی مدد کے لئے تیار نہیں ہے۔ اور والدین بھی صرف سر جھکا کر خاموش بیٹھے رہتے ہیں، ایک لفظ بھی نہیں کہتے۔ ایوری نے سر کو ذرا سی جنبش

دی اور خاموش بیٹھا رہا۔ لیکن ابھی تک اس کو بات سمجھ نہیں آئی تھی۔ لیکن وہ چپ رہا اور کوئی سوال نہیں کیا کیونکہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کورمین بات کو زیادہ طول دے۔ "میں چاہتا ہوں کہ آپ اور آپ کا دوست عدالت میں آئیں اور ایسے ظاہر کریں جیسے وہ مرنے والی لڑکی کے والدین کے ساتھ ہیں۔ عدالت میں تھوڑا ہنگامہ برپا کریں۔ تھوڑا شور مچائیں. مخالف پارٹی پر چیخیں۔ اسے قاتل کہیں۔ تھوڑا روئیں، تھوڑا سا لعن طعن کریں، لیکن نسل پرستی پر کوئی بات نہ کرنا، صرف یہ کہہ دینا کہ 'تم گندگی کا ڈھیر' ہو اور اس نے ہم سے اسی طرح کی کچھ اور باتیں کیں۔ مختصر یہ کہ بس وہاں عدالت میں جج کو آپ کی موجودگی کا احساس ہونا چاہیے۔ اسے سمجھنے کی ضرورت ہے کہ اس شہر میں ایسے لوگ ہیں جو سمجھتے ہیں کہ یہ آدمی (ڈرائیور) ایک گھٹیا انسان ہے۔ ہو سکتا ہے میری یہ سب باتیں آپ کو بے وقوفانہ لگ رہی ہوں؟ لیکن اس طرح کی حرکتیں ججوں کو بہت متاثر کرتی ہیں۔ ایسی باتیں ان کو ہلا کر رکھ دیتی ہیں، ان کے پرانے، خشک قوانین سے سڑے ہوئے نظام کو بھی ہلا کر رکھ دیتی ہیں، یہ سب انہیں حقیقی دنیا کے کے لئے جھنجھوڑ دیتا ہے۔ ایوری کوشش کرتا رہا کہ

چرس کے بارے میں بات کرے۔ "میں اب اسی کے متعلق ہی بات کرنے والا ہوں" کورمین نے اسے کاٹتے ہوئے کہا۔ "اگر تم دونوں مجھے عدالت میں اپنا صرف آدھا گھنٹہ دے دو تو میں تم دونوں کو دس دس گرام چرس دوں گا۔ اگر تم لوگ عدالت میں زرا زور سے چیخ سکو تو شاید میں پندرہ گرام ہی دے دوں۔ " اب بتائیں آپ کیا کہتے ہیں اس بارے میں؟" "مجھے صرف ایک گرام کی ضرورت ہے،" میں نے اسے بتایا۔ "آپ ایک گرام مجھے بیچ سکتے ہیں؟ آپ کا اور میرا آج کا دن بہتر بن جائے گا۔ میں اس کو بیچوں گا؟ کورمین زور سے ہنسا۔ "وہ بھی پیسے کے لیے؟ کیا تم لوگ مجھے ایک ڈیلر سمجھ رہے ہو؟ میں تو بطور تحفہ بھی اکثر اپنے دوستوں کو دے دیا کرتا ہوں۔ "تو مجھے بھی بطور تحفہ ہی دے دو" میں تم سے التجا کرتا ہوں۔ "صرف ایک گرام کی ہی تو بات ہے!" "لیکن بھول گئے میں نے تمھیں ابھی کیا کہا ہے؟" کورمین ایک ناخوشگوار مسکراہٹ کے ساتھ مخاطب ہوا۔ "میں تمھیں دے دوں گا، لیکن پہلے تمھیں یہ ثابت کرنا ہو گا کہ تم واقعی دوست ہو۔" اگر یہ سب ایوری کے لیے نہ ہوتا تو میں کبھی راضی نہ ہوتا، لیکن وہ مجھے بتا رہا تھا کہ یہ ہمین ایک

موقع ملا ہے اور ویسے بھی ہم کوئی خطرناک کام نہیں کر رہے نہ ہی قانون توڑ رہے ہیں۔ تمباکو نوشی غیر قانونی ہے ، لیکن ایک عرب پر چیخنا جو کہ ایک چھوٹی بچی کو مار کر بھاگ نکلا تھا۔ یہ نہ صرف قانونی ہے، بلکہ سر اسر معمولی بات ہے۔ میں نے پوچھا "کون جانتا ہے کیا پتہ وہاں کیمرے لگے ہوں اور لوگ ہمیں رات کی خبروں میں دیکھ کر پہچان لیں۔ "لیکن یہ ظاہر کرنا کیوں ضروری ہے کہ ہم اس لڑکی کے رشتہ دار ہیں؟ "میرا مطلب ہے، لڑکی کے والدین پہچان لیں گے کہ ہمارا ان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔" ایوری نے کہا، "اس نے ہمیں یہ نہیں کہا کہ ہم نے وہاں یہ بھی بتانا ہے کہ ہم اس کے رشتہ دار ہیں۔ اس نے صرف اتنا کہا کہ ہم نے وہاں جا کر چیخنا ہے۔ اگر کوئی پوچھتا ہے تو ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے اس کے بارے میں اخبار میں پڑھا ہے۔ یا یہ کہ ہم یہ گفتگو کورٹ سے ملحقہ کمرے میں بیٹھے سن رہے تھے، جس کمرے میں کافی اندھیرا ہے اور جہاں پہ گٹر اور پھپھوندی کے مرکب جیسی بدبو آتی ہے۔ ہم دونوں راستے میں اسی موضوع پر بحث کرتے جا رہے تھے، بہر حال ایک بات واضح ہے کہ میں اب اس منصوبے میں شریک تھا ورنہ میں ایوری کے ساتھ

سکوٹر پر سوار نہ ہوتا۔ "فکر مت کرو، اس نے مجھ سے کہا۔ "میں ہم دونوں کے لیے اکیلا چیخ لوں گا۔ تمہیں کچھ بھی کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بس اس طرح ظاہر کرنا جیسے تم میرے دوست ہو اور مجھے پر سکون کرنے کی کوشش کر رہے ہو۔ بس انہیں احساس ہونا چاہیے کہ ہم ساتھ ہیں۔ ڈرائیور کا آدھا خاندان پہلے سے ہی وہاں موجود تھا، جو ہمیں لابی میں گھور رہا تھا۔ ڈرائیور خود موٹا تھا اور واقعی جوان نظر آتا تھا، وہ ہر نئے آنے والے کو سلام کر رہا تھا، ان سب کو بوسہ دیتا تھا، جیسے وہاں کوئی شادی ہے۔ مدعی کی میز پر کورمین کے ساتھ ایک اور نوجوان داڑھی والا وکیل بیٹھا تھا، اور اس کے علاوہ لڑکی کے والدین بیٹھے تھے۔ انہیں دیکھ کر ایسا نہیں لگ رہا تھا جیسے وہ شادی میں آئے ہوں۔ وہ بے حد لاغر معلوم ہو رہے تھے۔ لڑکی کی ماں شاید پچاس کے لگ بھگ یا اس سے کچھ بڑی ہو گی لیکن اس کا وجود ننھے پرندے کے جیسا دکھائی دیتا تھا۔ اس کے چھوٹے سرمئی بالوں کی بری حالت کی وجہ سے وہ بالکل اعصابی خلل کی مریضہ دکھائی دے رہی تھی۔ باپ آنکھیں بند کیے وہاں بیٹھا

تھا۔ ہر تھوڑی دیر بعد وہ اپنی آنکھیں ایک سیکنڈ کے لیے کھولتا تھا، اور دوبارہ بند کر لیتا تھا۔

کارروائی شروع ہوئی، اور ایسے لگا جیسے ہم کسی پیچیدہ عمل کے میں پھنس گئے ہوں، ہر چیز بہت پیچیدہ اور بکھری ہوئی لگ رہی تھی۔ وکلاء حضرات مختلف موضوعات پر بڑبڑا رہے تھے۔ میرے دماغ میں ایسی تصویر بن رہی تھی جیسے میری اور شکما کہ بیٹی کو کار کی ٹکر سے مار دیا گیا ہو۔ ہم دونوں تباہ ہو چکے ہوں، لیکن پھر بھی ہم ایک دوسرے کا ساتھ دے رہے ہوں، اور پھر وہ میرے کان میں سرگوشی کرے، "میں چاہتی ہوں کہ اس ذلیل قاتل کو سزا ملے۔" یہ سب تصور کرنا اچھا نہیں لگ رہا تھا، لہذا میں نے تصور کرنا ختم کر دیا۔ اور اس کے بجائے میں نے سوچا کہ کیسا لگے گا اگر ہم دونوں اپنے اپارٹمنٹ میں ہوں، ساتھ تمباکو نوشی کر رہے ہوں، اور ٹی وی میں جانوروں کے بارے میں کوئی پرگرام چل رہا ہو نیشنل جیوگرافک چینل پر۔ اور کسی طرح ہم ایک دوسرے کے قریب آنے کی کوشش کر رہے ہوں اور شکما میرے بہت قریب آجائے۔ "ہائنا!" ایوری گیلری میں چھلانگ لگا کر چیخا۔

"تم کس بات پر مسکرا رہے ہو؟ تم نے ایک چھوٹی بچی کو قتل کیا ہے۔ اور یہاں اپنی پولو شرٹ میں ایسے کھڑے مسکرا رہے ہو جیسے تم کسی تفریحی بحری سفر پہ آئے ہوئے ہو۔ وہ لوگ تمھیں کسی سلاخوں کے پیچھے سڑنے کے لئے پھینک دیں گے۔ ڈرائیور کے چند رشتہ دار ہماری سمت ہی آ رہے تھے، لہذا میں کھڑا ہو گیا اور اس طرح ظاہر کیا جیسے میں ایوری کو پر سکون کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ ویسے حقیقت میں بھی، میں ایوری کو پر سکون کرنے کی کوشش ہی کر رہا تھا۔ جج نے سخت آواز میں کہا کہ اگر ایوری نے چیخنا بند نہ کیا تو عدالتی افسران اسے عدالت سے باہر نکال دیں گے، جو کہ اس وقت ڈرائیور کے پورے خاندان کے ساتھ بحث کرنے سے تو بہتر کام ہی لگ رہا تھا، جو کہ صرف ایک ملی میٹر کے فاصلے پر کھڑے تھے اور ایوری کو لعنتیں دے رہے تھے۔ تم سب لوگ دہشت گرد ہو ایوری ایک دم چیخ اٹھا "تم لوگ سزائے موت کے مستحق ہو۔" مجھے نہیں معلوم کہ وہ ایسا کیوں کہہ رہا تھا۔ لیکن ایک مونچھوں والے آدمی نے آگے بڑھ کر اس کے ایک تھپڑ رسید کر دیا۔ میں ان دونوں کے درمیان میں آ کر ان کو الگ کرنے کی کوشش کرتا رہا، اس دوران

میرے چہرے پر ایک زور دار مُکا آ کر لگا۔ عدالت کے افسران نے ایوری کو پکڑ کر عدالت سے باہر گھسیٹا۔ وہ آخری بار پھر سے چلایا "تم نے ایک چھوٹی بچی کو مار ڈالا۔ تم نے ایک پھول مسل ڈالا۔ کاش وہ تمہاری بیٹی کو بھی قتل کر دیتے۔" لیکن اس وقت تک میں فرش پر گر چکا تھا اور میری ناک یا شاید پیشانی سے خون بہنے لگا — میں پورے یقین سے نہیں بتا سکتا۔ جس وقت ایوری ڈرائیور کی بیٹی کے قتل کے بارے میں چیخ رہا تھا، اسی دوران کسی نے میری پسلیوں پر زور دار لات ماردی۔ جب ہم واپس کورمین کے گھر پہنچے تو اس نے اپنا فریزر کھولا اور مجھے منجمد مٹر کا ایک بیگ دیا چوٹ پر لگانے کے لئے، اور مجھے کہا کہ اس کو زور سے دباؤ۔ ایوری اس سے یا مجھ سے بات نہیں کر رہا تھا، صرف اتنا پوچھا کہ چرس کہاں ہے؟ کورمین نے اس سے کہا کہ تم نے ان کو دہشت گرد کیوں کہا جب میں نے تمھیں خاص طور پر منع کیا تھا کہ اس بارے میں ہر گز کوئی ذکر نہ کرنا کہ وہ عرب ہیں۔

دہشت گرد کہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں نے ان کو عرب مخالف کہا ہو۔" ایوری اپنے دفاع میں بولا۔ یہ صرف ایسے ہے جیسے کسی کو قاتل کہہ

دیا جائے۔ ہر طرح کے علاقوں میں دہشت گرد ہوتے ہیں۔" کورمین نے اسے کچھ نہیں کہا۔ وہ غسل خانے میں گیا اور دو چھوٹے پلاسٹک کے تھیلے لے کر باہر آیا۔ اس نے ایک تھیلا میرے ہاتھ میں دیا اور دوسرے کو ایوری کی طرف اچھال دیا، اس نے جھٹ سے اسے کیچ کر لیا۔ "ہر ایک میں بیس گرام ہیں،" کورمین نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ اور سامنے کا دروازہ کھول دیا۔ "آپ مٹر بھی اپنے ساتھ لے جاسکتے ہیں۔" اگلی صبح کیفے میں، شکما نے مجھ سے پوچھا کہ میرے چہرے کو کیا ہوا ہے؟ میں نے اسے کہا کہ ایک چھوٹا سا حادثہ پیش آیا تھا۔ میں ایک دوست سے ملنے گیا تھا اور وہاں کمرے کے فرش پر اس کے بچے کے کھلونے سے پھسل گیا تھا۔ "اور میں سوچ رہی تھی کہ شاید تمھیں ایک لڑکی نے مارا پیٹا ہے،" شکما نے ہنستے ہوئے کہا، اور میرے لیے میری کافی لے آئی۔ "کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔" میں پھر سے مسکرانے کی کوشش کرنے لگا۔۔ "میرے ساتھ کچھ دیر گھومنے چلو تو تم مجھے لڑکیوں اور دوستوں سے مار کھاتے اور بلی کے بچوں کا دفاع کرتے ہوئے دیکھو گی۔ لیکن میں نے ہمیشہ مار کھائی ہے، میں نے خود کبھی مار پیٹ نہیں کی۔" تم بالکل میرے بھائی

کی طرح ہو،" شکما نے کہا۔ " وہ بھی اسی قسم کا لڑکا جو لڑائی کو ختم کرنے کی کوشش کرتا ہے اور خود مار کھالیتا ہے۔" میں اپنے کوٹ کی جیب میں بیس گرام کے بیگ کی سرسراہٹ محسوس کر سکتا تھا۔ لیکن اس پر توجہ دینے کے بجائے میں نے اس سے پوچھا کہ کیا اسے اس خلاباز کے بارے میں بنائی گئی نئی فلم دیکھنے کا موقع ملا؟ جس کا خلائی جہاز دھماکے سے اڑا جاتا ہے، اوراسے جارج کلونی کے ساتھ بیرونی خلا میں پھنسا کر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اس نے نہیں کہہ کر مجھ سے پوچھا کہ اس فلم کا ہماری باتوں کے ساتھ کیا تعلق ہے؟ "کوئی تعلق بھی نہیں ہے" میں نے کہا۔ لیکن وہ بہت اچھی فلم ہے۔ دراصل D 3 ہے، اور عینک لگا کر دیکھی جاتی ہے۔ کیا تم وہ فلم میرے ساتھ دیکھنے چلو گی؟" ایک لمحے کو خاموشی چھا گئی۔ اور مجھے پتہ تھا اس خاموشی کے بعد ہاں یا نہیں سننے کو ملے گی۔ اسی دوران وہ تصویر میرے خیالوں میں واپس دوڑی، شکما رو رہی ہے۔ ہم دونوں عدالت میں میں ہیں، ہاتھ پکڑے ہوئے۔ دوسری تصویر تبدیل کرنے کے لئے، میں چینلز کو تبدیل کرنے کی کوشش کرتا ہوں، ہم دونوں میرے کمرے میں صوفے پر بیٹھے ہیں ایک دوسرے کو بوسہ دینے کی

کوشش کرتے ہیں لیکن ناکام رہتے ہیں۔ اور اس تصویر کو میں اپنے تصور سے ہٹا نہیں سکا۔